ISSN: 2583-8784 (Online)

اردو اسٹڈیز
URDU STUDIES
Vol 3 Issue 1 October 2023

اردو اسٹڈیز
Urdu Studies

Pages 46-51
www.urdustudies.in
Included in
UGC-CARE List

"Hastam agar mī ravam" © 2023 by Shafiq Fatima Shera is licensed under CC BY-NC-ND 4.0

Hastam agar mī ravam
Shafiq Fatima Shera

گوشۂ شفیق فاطمہ شِعریٰ

ہستم اگر می روم (گر نہ روم نیستم)

شفیق فاطمہ شِعریٰ

میں نے برگد کی پارنبیوں سے ایک ہی جنم میں کئی جنم لینا سیکھا۔

اپنے عہد کے بے شمار افراد کی طرح ہم نے ہجرت کے دن دیکھے۔ ہجرت ہمارے لیے پرانی دنیا سے نئی دنیا کی جانب پرواز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے ایک عجیب سی انجانی خوشی اس دوران میں محسوس ہوئی اور سارے مصائب اس خوشی کی لہروں میں بہتے نظر آئے۔

اس سے پہلے ہم عہد وسطیٰ کی ایک خانقاہ میں جیتے تھے۔ اس خانقاہ نے ہمیں جس سخت کوشی کا عادی بنایا تھا وہ آگے چل کر بہت کام آئی۔ عام مراسم کی دنیا میں شعریٰ کی حیثیت سے مجھ کو کم پہچانا گیا، اس لیے کافی دلچسپ مشاہدہ رہا۔ فی الحال میں اورنگ آباد کے ایک کالج میں پڑھاتی ہوں۔

اس نئے نام کو دریافت کرنا ایک نئی زندگی کو دریافت کرنا تھا۔ قدیم عربوں میں سے جس کسی نے ایک ستارے کو شِعریٰ نام دیا تھا وہ یقیناً شاعر رہا ہوگا۔ جاہلیت کے عرب اس ستارے کو پوجتے تھے اس لیے ہبل اور لات وعزیٰ کی طرح اسے بھلا دیا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنایا۔

افراد اور اشیا کی جو سطح ہو اس میں سرایت کر کے میں انہیں پاتی ہوں۔ کبھی کبھی وہ سطحیں مجھ میں راسخ ہو جاتی ہیں، تب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی مجھ کو آواز دے — میری اپنی سطح ہے۔ میں اسی سطح پر رہ کر لکھ سکتی ہوں۔

پھر چند صفحات میں اس زندگی کو مکمل طور پر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے جبکہ تعارف لکھتے وقت صرف ایک موجود لمحہ، ایک کیفیت ہوتی ہے جو ہم پر زیادہ حاوی ہوتی ہے۔

اپنا تعارف کرانے سے پہلے کتنی بے شمار چیزوں کا تعارف کرانا ضروری ہوتا ہے جن کے ہمارے درمیان وقت مشترک ہو گیا۔

پھر وقت کے ہر پل کی جڑیں کتنے دور دراز زمانوں میں پیوست ہیں — تو پھر یہ طلسم ہوش ربا لکھنا کس کے بس کی بات ہے۔ ہمیں تو نظموں کے مسودے صاف کرنے کا وقت بھی مشکل سے ملتا ہے۔

زیادہ سوچنے کی وجہ سے مجھ کو ہر شے کی قدر و قیمت ڈانواڈول نظر آئی، تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ زندگی کو بے معنی سمجھا جائے۔ مگر میں نے شعوری طور پر اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا کہ زندگی بے معنی ہے۔ اور اس انکار ہی میں میری زندگی کا جواز تھا — یہاں تک کہ ایک نئی سطح پر یہ محسوس ہوا کہ یہ عہد در اصل نئے سرے سے ہر شے کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا عہد ہے۔

اور ہر شے میں شاعری بھی شامل ہے۔ اور شاعری خود بھی نئے سرے سے ہر شے کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا عمل ہے۔ (یہ) ہمارے لیے دنیا کے بجائے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے اور اس پس منظر سے جو آواز ابھرتی ہے وہ ہماری اپنی آواز ہے، اس پس منظر کی نہیں۔ اب یہ چاہے شور و شیون ہو چاہے سرگوشی، دونوں صورتوں میں ہمارے وجود کا مسلسل آشکار ہوتا ہوا مفہوم ہے — اور ہمارا وجود کسی دور دراز گیند کی طرح پڑی ہوئی اکائی نہیں ہے کہ جب ہم اپنی بات کریں تو اصطلاحی انفرادیت پسندی کی تعریف میں محدود ہو کر رہ جائیں۔

شاعری کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے بیدل اور رلکے کی خوبصورت تعلی یاد آتی ہے جب دھنک کے رنگوں ایسی تہہ بہ تہہ آوازوں کے تسلسل سے ہو کر وجود کی غائت اقصی تک پہنچتے ہیں جو انہی آوازوں میں مضمر تھی۔

اتنی اونچی بات کرنے کے بعد جب قدم زمین پر آتے ہیں تو آواز کلاسیکیت کی چمکتی نمناک مرمریں سلوں میں چنی ہوئی ملتی ہے—یہاں سے ہمارا شکست وریخت کا کام شروع ہوتا ہے۔

میں نے شکست وریخت کی جگہ خود پگھل کر اپنے اطراف کے اس قیمتی ملبہ کو پگھلانا چاہا اور کچھ دن تک میرا لہجہ اسی پگھلے ہوئے ہیرے جواہرات کے پلاسٹر سے عبارت رہا۔

اب مجھے لہجے کی زیادہ سے زیادہ راست شکل درکار ہے جسے عرف عام میں پیچیدہ کہا جاتا ہے۔

اقبال نے ایک ہی زندگی میں کئی زندگیاں گزاریں تب کہیں انہوں نے اپنے پیشرو شاعروں کے اور اپنے درمیان کوئی خلا نہیں چھوڑا۔ گو کہ ان کا دور پختگی کا لہجہ جو الماس کی صلابت اور شعاع آفتاب کی تابانی سے مل کر بنا تھا، ایک ہی جست میں کئی صدی کی مسافت طے کر گیا۔

مگر میراجی اور اقبال کے درمیان ایک طویل تعطل کا خلا ملتا ہے، جسے میراجی کی سہل انگاری نے پر نہیں کیا۔ میراجی بہ اعتبار کیفیت شدید ہیں، مگر کمیت بھی اپنا مخصوص وزن رکھتی ہے۔ اس کے بغیر وقت کے وفور اور پھیلاؤ کو نہیں سمیٹا جا سکتا۔

لہجہ سے قطع نظر، ان دونوں شاعروں میں انسانی شعور اور لاشعور کے درمیان بھی گہری کھائی حائل نظر آتی ہے۔ جبکہ بنیادی طور پر یہ ایک ہی وحدت کے ارتقائی مدارج ہیں۔

اس خلا پر میری نظر ہے اور میرا ارمان ایک سیلاب کی طرح مچلتا ہے کہ اسے پر کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

جب ہم لمبی چھلانگ لگانا چاہیں تو پیچھے سے زیادہ فاصلہ لے کر دوڑنا پڑتا ہے، اسی طرح یہ رجعت تاریخی تسلسل کو زیادہ بھرپورپن عطا کر کے اس سے آگے بڑھنے کی توانائی حاصل کرتی ہے۔

میر اپنے لہجہ کو لہجہ کی بنیادی ابتدائی مانوس سطح پر دریافت کرتے ہیں، جیسے کوئی زمین کی گہری سخت پرتیں توڑ کر ٹھنڈے میٹھے جل تک پہنچے۔ جب اس عمل میں باخبری شامل ہو تو اس کا نام تجربہ ہو گا—یہ تجربہ میر کو عام اساتذہ سے ممتاز کرتا ہے جن کی نظر صرف روز مرہ پر رہی۔

میر کے لہجے کی کرامت یہ ہے کہ میر کی تجرید کی جائے تو لہجہ بنتا ہے اور لہجہ کی تجسیم کی جائے تو میر بنتے ہیں۔

لہجہ کے تعلق سے مشکل یہ ہے کہ وہ انفرادیت کا پرتو ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی بنیاد بھی رکھتا ہے—فرد ایک اڑان میں صدیوں کی مسافت طے کر سکتا ہے، مگر جمعیت کا ارتقا تدریجی ہوتا ہے۔ میر ہمیں اس تضاد کو توازن بنانا سکھاتے ہیں۔

کتابی اور قدرتی لہجہ کی تفریق ناسخ کے عہد سے شروع ہوئی جو اب تک باقی ہے۔ اور تبھی سے ہندوستان کے اپنے لسانیاتی تسلسل کے ورثہ کو کھو کر لہجہ اس بالیدگی اور زرخیزی سے محروم ہوا جو اس کی امکانی قوت تھی۔

☆

شاعر خواتین میں مجھ کو میرا اور قرۃ العین طاہرہ سے دلچسپی رہی۔ ان کے نغمے سے بھی، ان کی زندگی سے بھی۔ ان کا سماج آج کے سماج کے مقابلے میں زیادہ جامد تھا۔ اس لیے ان کا زہر کا پیالہ زیادہ چھلکتا ہوا تھا۔

کوئی قوت تھی جس نے ان کے لیے ریت رواج کے سب بندھن توڑ دیے۔ انہیں الزام سہنا سکھایا، اور عذاب بھگتنا، اور شعرا کی صلیب سے زیادہ بڑی صلیب اٹھانا۔ یہ قوت ان کی آواز تھی، ان کا نغمہ تھا جو آزاد اور ذمہ دار انسانی موقف سے پھوٹتا ہے۔ یہ انسانی موقف دونوں صنفوں میں ایک ارتقائی امکان بن کر مضمر رہتا ہے۔ مگر یہ ستم ظریفی ہی تھی کہ نسوانیت کے لیے یہ امکان شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا آیا۔

یہ دونوں بے قرار روحیں اسی امکان کو اجاگر کرتی نظر آتی ہیں، اپنی مسلسل قربانیوں سے—ان کی تحریک سرد کا سرچشمہ چاہت میں تھا۔ یہ چاہت انسان کی تھی جس میں انہوں نے الوہیت کی

روشنی ملائی۔ یا، ممکن ہے الوہیت کی ہو جس میں انہوں نے انسان کی آمیزش کی۔ بہر حال، اس دور میں ان کے لیے اسی آمیزش کی سمت سے بساط ہونا ممکن تھا۔

میں الوہیت کو اس کا منفرد مقام دیتی ہوں، جہاں شرکت روا نہیں۔ اس مقام پر انسان شخصیت رہ جاتا ہے۔ علامت، نظریہ یا اور کوئی پیچیدگی نہیں۔

میں نے اسے آدرش کے بجائے حقیقت کے روپ میں دریافت کیا——اور کسی محیر العقول کارنامے سے نہیں بلکہ لہجہ کی سچائی اور اور اس مطابقت سے جو دل اور نگاہ ہو، میں نے اسے پہچانا۔

کبھی کبھی اشیا میں بھی میرے لیے شخصیت جاگ اٹھتی ہے——ایک پیپل کا پیڑ جس پر نرم اور سمسماتی گلابی پتیاں شمعوں کی طرح روشن تھیں، اور وہ سورج اور ہواؤں کی زد پر سر بلند کھڑا تھا، مجھ کو ماورائی شے نظر آیا—— میں اس دور میں اس حد تک تجریدی ہو گئی تھی کہ بعض محسوس اشیا ماورائی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اور میں نے ایک گیاہی پھول سے کہا تھا کہ مجھ کو بھی موجود ہونا سکھا دے، اپنی ہی مانند۔

بعض مقامات کسی خاص لمحہ میں سرگوشی کرتے نظر آتے ہیں جن میں اورنگ آباد کی زمین میری سکھی ہے——اس کائنات کا کوئی ذرہ میری دلچسپی سے خارج نہیں۔ لیکن اس سے مجھ پر کائناتی ہونے کا الزام نہیں آتا—— اصطلاحی معنوں میں کائناتی شاعری کا مطلب بے ضرر شاعری ہے اور آفاقیت کا مطلب شخصیت سے محرومی۔

ہم کائناتی کیسے بن سکتے ہیں جبکہ ایک طویل عہد غلامی کا پس منظر رکھتے ہیں۔ اور تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات کے راست مشاہد ہیں۔ ہماری سماجی زندگی میں مٹے ہوئے درباروں اور حرم سراؤں کی باقیات الصالحات انسان بن کر بھٹکتی ہیں——اور سائنسی عہد کُلُّ مَن عَلَیہا فَانٍ پڑھتا ہوا رواں دواں ہے۔ عظیم اور مہیب جنگوں سے تباہ کا پہلو اس کا یہ ہے کہ افراد کو بے قدری اور بے وقعتی کے مقام پر لے جا کر علیحدہ علیحدہ تقسیم کرتا ہے۔ جو اس سے بچیں انھیں اقدار، عقائد اور نظریات نگل لیتے ہیں، وہ انھیں بالکلیہ ان کی ذات سے تہی کر کے خود ان کے قائم مقام بن جاتے ہیں۔ مگر تابہ کے۔ کچھ دن

بعد انھیں خود بھی مٹنا پڑتا ہے کہ ذات جو ان کی بنیاد تھی، پہلے ہی مٹ چکی۔ تب ایک خلا سائیں سائیں کرتا ہے اور یہ خلا قدیم عہد کے ناقص نظام اخلاق کا قائم مقام ہوتا ہے۔

تب شاعر کو گولی ماریئے، کہ انسان کی حیثیت سے باقی رہنا بھی آج ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اور شاعر کو آپ کیوں گولی ماریں—؟

ہمارے نقادوں نے اردو غزل پڑھ پڑھ کر یہ جانا کہ تغافل مہلک شے ہے، تو وہ ہمیں تغافل سے ہلاک کیے دیتے ہیں۔

اس صورت حال میں داؤد نبی کا عہد یاد آتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے لوہا پگھلا کر زرہیں بنائیں تو پوری قوم اسی کام میں جٹ گئی۔ بیچارے داؤد نبی کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ غم کھاتے تھے اور تنہا گاتے تھے۔ تو چھوٹے پیمانے کے اس سائنسی عہد میں بھی خدا آخر خدا تھا، کام آیا اور پہاڑوں کو مامور کیا کہ وہ اس اکیلے مغنی کو صدائے بازگشت دیں—تب سے جو پہاڑوں نے بازگشت دینا سیکھا تو آج تک دیتے ہیں۔

رومی نے ایک انسان پایا جس کا نام حسام الدین چلپی تھا۔ اس کے دل سے انھیں اپنی صدا کی جو گونج ملی وہ ان کے دل میں نئی نئی نواؤں کے چمن کھلاتی رہی۔ حسام الدین رومی کی آواز کے لیے کشادہ فضا بن گئے جس میں وہ پھیل سکی۔ تب رومی نے اپنے عہد اور آنے والے وقت کو بھی مثنوی کے نہ سمجھنے پر صاف کر دیا کہ حسام الدین ان کے لیے عہد بھی تھے اور وقت بھی۔

آج بھی ان کی گرانمایہ مثنوی پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ حسام الدین اسے لگاتار سنے جا رہے ہیں، اور یہ پہلو مثنوی کا سب سے دلکش پہلو ہے—رومی نے سماع کو گویائی کے مساوی اہمیت دی اور ان کے عہد سے سماع (سننا) جذب میں ڈوبے ہوئے رقص دوام کا مترادف سمجھا گیا۔

تو حاصل یہ ہے کہ انسان پہاڑوں سے زیادہ خوبصورت بازگشت دیتا ہے۔

(محور، خاص اشاعت، ۱۹۶۶)